Date of Publication: 23-02-204

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 24-25 Feb. 2014
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

# ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

یکم تا ۷ مارچ ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۹، جلد نمبر: ۷۳

1-7 March 2014
Issue: 9, Vol.:73

# مرزا غالب کا ایک نادر فارسی مکتوب

ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی
ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-25
E-mail: muftimushtak@gmail.com

ارسطو جاہ مولوی سید رجب علی خاں (متوفی ۱۸۶۹) ابن سید علی بخش معروف شخصیت ہیں۔ جگراؤں ضلع لدھیانہ میں پیدا ہوئے دہلی میں تعلیم پائی۔ لارڈ لارنس گورنر پنجاب کے میر منشی مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کی سعی انقلاب میں انگریزی حکومت کا ساتھ دیا۔ ریاست اور جاگیر حاصل کی۔ مذہباً شیعہ تھے، مرزا غالب کے ان کے ساتھ بڑے نیازمندانہ روابط تھے۔ اس خط سے بھی اس نیازمندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے بھی مرزا غالب کی بڑی تعریف و توصیف کی ہے ان کا ایک خط اودھ اخبار کے شمارہ ۲۰ مئی ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا تھا اس خط پر پتا لکھا ہے "بموقف نعال در شاہ جہاں آباد یسامی مطالعہ فخر زماں وزمانیاں نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ، اسد اللہ خاں بہادر" اسی خط میں لکھا ہے "زبان اختر سپہر فصاحت، ورخشاں نیر سمائے بلاغت فروغ انجمن ہمہ داناں، مسلم الثبوت ہفت زباناں، آرائش وسادہ قدسیاں، مصداق ان من الشعر لحکمۃ وان من البیان لسحر، رئیس زماں غالب الشعرا و میرزائے مرزایاں" یہ خط مولوی سید رجب علی نے قاطع برہان کی حمایت میں لکھا تھا اور اس میں اس کتاب کی بڑی تعریف کی ہے۔

مرزا غالب نے مولوی رجب علی کے نام متعدد خطوط لکھے ان میں سے کئی خط مرزا کے خطوط کے مجموعوں میں شامل ہیں زیر نظر خط بھی ان کے نام ہے اور یہ خط کئی اعتبار سے اہم ہے۔ یہ مولوی رجب علی کے نام غالب کا پہلا خط ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ منشی جواہر سنگھ نے باہمی تعلقات کی یہ سبیل نکالی تھی۔ اس خط میں ایک قطعہ بھی ہے۔ غالباً یہ بھی مرزا غالب کا ہے اور ان کے کسی مجموعۂ اشعار میں شامل نہیں ہے۔ ارسطو جاہ کے نام مرزا غالب کے دو خط 'پنج آہنگ' میں شامل ہیں، دو خط باغ دو در میں، لیکن وہ چاروں خطوط بعد کے ہیں ان کے نام سب سے پہلا خط یہی ہے۔ یہ خط مئی ۱۸۴۷ء کا ہے۔ غالب نے اس خط میں یہ درخواست بھی کی ہے کہ مولوی رجب علی ان کے نام مستقل خط لکھیں اور لالہ جواہر سنگھ کے لفافے میں نہ بھیجیں۔ تاہم مولوی رجب علی نے اس کا اہتمام کیا تھا اس کا اندازہ مرزا غالب کے ایک دوسرے خط سے ہوتا ہے جو دسمبر ۱۸۴۷ء کو لکھا گیا۔ اس خط میں لکھا ہے "پیش ازیں عرضداشتے کہ چاشنج توقیع مشفقت بود بسبیل ڈاک ارسال داشتہ ام عجب کہ بنظر انور گزشتہ باشد" (اس سے قبل ایک عرضداشت جو آپ کے مہربانی نامہ کے جواب میں تھی، بسبیل ڈاک ارسال کی تھی امید کہ نظر نواز ہوئی ہوگی)۔ اس خط کے ساتھ غالب نے سرسید احمد خاں کی کتاب 'آثار الصنادید' کا ایک نسخہ بھی ارسال کیا تھا اور ازروئے احتیاط بیرنگ ارسال کیا تھا۔ یہ دونوں خط غالب کی اپنی تحریر میں موجود ہیں۔ اور دونوں خطوط کے عکس مولوی سید رجب علی کے پوتے سید آغا حسین نے فراہم کیے تھے۔ زیر نظر خط کا عکس مجلہ 'ہمایوں' لاہور میں شائع ہوا تھا اور دوسرے خط کا عکس غلام رسول مہر نے

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

## ہندستان کی مشترکہ تہذیب کا تاریخی پس منظر اور اردو ادب

### (انجمن ترقی اردو [ہند] کا سہ لسانی [اردو، ہندی، انگریزی] بین الاقوامی سمینار)

انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام ۷ تا ۹ مارچ ۲۰۱۴ "ہندستان کی مشترکہ تہذیب کا تاریخی پس منظر اور اردو ادب" کے موضوع پر سہ روزہ بین الاقوامی سمینار انجمن کے مرکزی دفتر 'اردو گھر' 212 راؤز ایونیو، نئی دہلی میں منعقد کیا جا رہا ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۰۳ سے اردو کے تحفظ اور فروغ کی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ اردو کو تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کی زبان کے مناسب اور موزوں ذریعۂ اظہار بنائے۔

یہ سمینار بھی اسی مقصد سے منعقد کیا جا رہا ہے کہ اس پر کھل کر اظہار خیال ہو کہ تیزی سے بدلتے ہوئے ہندستانی سماج میں اردو کی وقعت اور توقیر قائم رہے اور اس میں اضافے کے لیے کیا مساعی کیے جائیں، اور یہ احساس بھی عام ہو جائے کہ اردو آج بھی ہندستان کی رنگا رنگ تہذیب کی نمائندہ ہے اور اس کا ادب ہندستانیت کا، ہندستانی روح کا آئینہ دار ہے اور یہ ہمیشہ سیکولر روایات کی علم بردار رہی ہے۔

انجمن کے اس بین الاقوامی سمینار میں ادب، تاریخ، صحافت اور تھیٹر کی دنیا کی اہم شخصیتوں کو اردو، ہندی یا انگریزی میں مقالات پیش کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ سمینار کا آغاز ممتاز ناقد اور دانش ور پروفیسر شمس الرحمن فاروقی کے کلیدی خطبے کے ساتھ ہوگا۔ دیگر شرکا میں عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی بھتیجی، ممتاز مورخ اور یونی ورسٹی آف ٹفٹس، امریکہ کی پروفیسر عائشہ جلال، ورجینیا یونی ورسٹی، امریکہ کی پروفیسر گیتا پٹیل، سینئر صحافی سعید نقوی صاحب، ورجینیا یونی ورسٹی کی پروفیسر مہر افشاں فاروقی، پروفیسر منیجر پانڈے، ڈاکٹر سرور الہدی، پروفیسر سید عقیل الرحمن، پروفیسر چمن تیواری، پروفیسر آذرمی دخت صفوی، پروفیسر اقتدار عالم خاں، پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر جاوید رحمانی، ڈاکٹر شاہد حسن کمال، ڈاکٹر فرحت احساس، ڈاکٹر مظفر حسین سید، نصرت ظہیر صاحب، ڈاکٹر یارا فاروقی، ٹوم آلٹر صاحب، کے. کے. کوہلی صاحب، دانش اقبال صاحب، پروفیسر تصدق حسین، پروفیسر چندر پٹیل، پروفیسر سینا زیدی، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر خورشید احمد، پروفیسر اصغر عباس، عبدالسمیع صاحب، ثاقب عمران صاحب، نوشاد منظر صاحب اور محمد مقیم صاحب کے علاوہ کئی اہم شخصیتیں شامل ہیں۔

سمینار کے آخری دن مولانا آزاد پر ایک پلے پیش کیا جائے گا جس کی ہدایت ڈاکٹر ایم سعید عالم نے دی ہے۔ یہ پلے دو گھنٹے پر مشتمل ہوگا۔ تھیٹر کی دنیا کی مشہور شخصیت ٹوم آلٹر، مولانا ابوالکلام آزاد کا کردار ادا کریں گے۔

**مقام:** اردو گھر، 212- راؤز ایونیو، نئی دہلی، **تاریخ:** 7 تا 9 مارچ 2014

مولانا آزاد کے یوم وفات کے موقعے پر

دوسری قسط

# تقسیم ہند کے پس منظر میں تین اہم کردار

# مولانا آزاد، سردار پٹیل اور محمد علی جناح

اسیم کاویانی (فلیٹ نمبر 702، کیتن اپارٹمنٹ، بیلویدرے روڈ، مجگاؤں، ممبئی 400010)
E-mail aseemkavyani@gmail.com

**سردار ولبھ بھائی پٹیل:**

مرارجی ڈیسائی نے انڈین نیشنل کانگریس کے صد سالہ یادگاری مجلے میں سردار ولبھ بھائی پٹیل کا تعارف لکھا ہے۔ اس کا خلاصہ یوں ہے کہ وہ نڈیاد کے ایک کاشت کار خاندان میں 1875 میں پیدا ہوئے تھے۔ میٹرک کرنے کے بعد وہ گودھرا میں وکالت کرنے لگے تھے پھر وہاں سے بورسد (ضلع کھیڑا) چلے گئے تھے جہاں جرائم کا گراف کافی بڑھا ہوا تھا۔ وہاں وکیل دفاع کی حیثیت سے ان کا بڑا شہرہ ہوا۔ 1909 میں جب ان کی بیوی کسی بیماری میں ایک اسپتال میں زیر علاج تھی اور وہ آنند میں قتل کے مقدمے میں ایک گواہ سے جرح کر رہے تھے، انھیں کاغذ کے ایک پرزے پر یہ الم ناک خبر دی گئی کہ اسپتال میں آپریشن کے دوران ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ انھوں نے کسی طرح کے جذبات ظاہر کیے بنا جرح کی کارروائی مکمل کی اور بعد میں دوسروں کو اس سانحے سے مطلع کیا۔ آگے چل کر آہنی انسان کہلانے والے ولبھ بھائی کے مزاج کے استقلال اور جذبات پر قابو رکھنے کا یہ پہلا عمل تھا جو لوگوں کے دلوں پر ثبت ہو گیا۔ 1910 میں وہ وکالت کی مزید تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے۔ 1913 میں بیرسٹری کر کے لوٹے اور پھر احمد آباد میں کامیابی کے ساتھ وکالت کرنے لگے۔

1918 میں انھوں نے ضلع کھیڑا کے مفلوک الحال کاشت کاروں پر سے لگان کی موقوفی کے لیے تحریک چلائی۔ اسی دور میں وہ گاندھی جی کی تحریک سے وابستہ ہو گئے اور جب 1928 میں باردولی میں ان کی قیادت میں محصول اراضی کا اضافہ ختم کرانے کی تحریک کامیاب ہو گئی تو وہاں کے کسانوں نے خوش ہو کر انھیں 'سردار' کہنا شروع کر دیا جو بالآخر ان کے نام کا جزو بن گیا۔ ہم بھی آئندہ سطروں میں انھیں سردار سے خطاب کریں گے۔

جیسا کہ مولانا آزاد نے لکھا ہے، سردار پوری طرح گاندھی جی کے ساختہ پرداختہ لیڈر تھے۔ 1931 میں گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد جب کانگریسی رہنماؤں کو داخل زنداں کیا گیا تو سردار سولہ ماہ تک گاندھی جی کے ساتھ یروڈا جیل میں رہے تھے۔

ڈاکٹر رفیق زکریا نے اپنی کتاب 'سردار پٹیل اور ہندوستانی مسلمان' میں ان کی شخصیت اور کردار کے کئی پہلو روشن کیے ہیں۔ مثلاً انھوں نے گاندھی جی کی تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد وکالت کے دور کا مغربی لباس، کلب کی زندگی کا لطف و انبساط اور شام ڈھلے کی برج پارٹیاں ساری چیزیں ترک کر دی تھیں اور تھوڑے ہی دنوں میں ظاہری اعتبار سے بھی پکے ہندوستانی بن گئے تھے۔ وہ ایک سخت مزاج (قوی الجثہ) اور کھرے اور بے لاگ لہجے کے انسان تھے۔ ان کے سلسلے میں مشہور تھا کہ ان کا جوتا ان کے کاٹنے سے زیادہ خطرناک ہے۔ بقول مینو مسانی وہ بہت ذہین تھے نہ وسعت نظر کے حامل۔ ان کے بارے میں یوسف مہرعلی کی کہی ہوئی یہ بات بھی مشہور ہے کہ 'اگر سردار پٹیل کسی کلچر سے واقف ہیں تو وہ صرف ایگریکلچر ہو سکتا ہے۔' دوسرے مذاہب تو دور رہے ان کو ہندو مذہب کا مطالعہ بھی کرنے کی توفیق کم تھی۔ اگرچہ کہا گیا ہے کہ انھوں نے 'رامائن' اور 'مہابھارت' کا مطالعہ کیا تھا، لیکن ان رزمیہ قومی داستانوں کے مطالعے سے تو ملک کے 90% پڑھے لکھے لوگ (مسلمان بھی) محظوظ ہوتے رہتے ہیں! ایک بار گاندھی جی کے سکریٹری مہادیو ڈیسائی سردار کا یہ سوال سن کر دنگ رہ گئے تھے کہ 'سوامی وویکانند کون تھے؟' اور سردار کو جیل ہو چکا تھا۔

مجموعی طور پر سردار ایک غیور، مصلحت ناپسند اور (تقسیم ملک سے قبل تک) غیر متعصب شخص تھے۔ انھوں نے دھرم کے ڈھکوسلوں اور فضول رسموں کا کبھی دفاع نہیں کیا۔ کانگریس کے پرچار کے جلسوں میں بھی انھوں نے لوگوں کے مذہبی جذبات کی پروا نہیں کی۔ ایک بار بچپن کی شادی کی مخالفت میں انھوں نے ہندوؤں کی مذمت کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ایسی مضحکہ خیز شادیاں رچانے والے ماں باپ اور پنڈتوں کو گولی مار دینے والے قانون پر عمل کریں گے۔ یہ جو مذہب کے خطرے میں ہونے کا واویلا مچایا جاتا ہے تو دراصل ان ہی والدین اور پنڈتوں نے مذہب کو خطرے میں ڈال رکھا ہے۔ اسی طرح انھوں نے مسلمانوں کو پردے کے رواج پر یوں للکارا تھا کہ "عورتوں کو پردے میں رکھتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی؟ یہ عورتیں تمھاری مائیں، بہنیں، بیویاں ہی تو ہیں، ان پر شک کرنے کا تمھیں کیا حق ہے؟ کیوں انھیں غلاموں کی طرح قید کر رکھا ہے؟ میرا جی چاہتا ہے کہ میں عورتوں سے کہوں کہ ایسے بزدل شوہروں کے ساتھ زندگی گزارنے سے تو بہتر ہے کہ وہ انھیں طلاق دے دیں۔" لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کوئی جدید طرز فکر کے حامل تھے۔ ان کے سوانح نگاروں نے انھیں قدامت پسند پایا ہے۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ احمد نگر کی جیل میں جب قیدیوں کو بیٹھنے کے لیے تکیے لگائے جا رہے تھے تو سردار پٹیل اور چند ساتھیوں نے تکیے لگوانے سے انکار کر دیا تھا۔ سیکولرزم کے نظریے کی 'بناوٹی' تعریف انھیں ناپسند تھی اور وہ نہرو کی سوشلزم کے بھی حامی نہ تھے۔ اس کے برخلاف وہ آزاد معیشت کے زبردست مؤید ہونے کی وجہ سے سرمایہ داروں میں مقبول تھے اور کانگریس پارٹی کے لیے فنڈ جمع کرنے کا ایک بڑا ذریعہ بھی۔ (عبوری حکومت کے دنوں میں مسلم لیگی وزیر خزانہ لیاقت علی خاں کے بجٹ کے ٹیکسوں نے تاجروں پر آفت ڈھا دی تھی، جن میں اکثریت ہندوؤں کی تھی، اس وقت سردار تلملا کر رہ گئے تھے۔)

تحریک آزادی کے دوران مولانا آزاد اور سردار پٹیل کے درمیان سیاسی فیصلوں میں اختلاف فکر اور اختلاف رائے کے کئی مرحلے آئے جن کا ذکر مولانا آزاد نے کیا ہے۔ مولانا نے سردار کے جن اقدامات سے اپنے اختلاف کا ذکر کیا ہے ان کے بین السطور میں کہیں کہیں اقلیتوں کی نسبت سے سردار کے نفرت انگیز نہیں تو غیر دوستانہ اور غیر ہمدردانہ رویے کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً 1935-36 میں بمبئی کی صوبائی وزارت کی تشکیل کے وقت سب کی یہ توقع تھی کہ وہاں کے ممتاز پارسی لیڈر مسٹر نریمان کو قیادت سونپی جائے گی لیکن پٹیل اور ان کے ساتھیوں نے بی جی کھیر کو بمبئی کے پہلے چیف منسٹر کے طور پر منتخب کیا تھا۔ مسٹر نریمان کی دادرسی گاندھی اور نہرو بھی نہ کر سکے تھے اور ان کا سیاسی کیریر ختم ہو گیا تھا۔ مزید یہ ہوا کہ 1937 میں کانگریس کی نافذ کردہ شراب بندی نے اس کاروبار کے اجارہ دار پارسی فرقے کی تجارت پر کاری ضرب لگائی تھی۔ مولانا نے اس فرقے کی وہ کیفیت کو سراہتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سب کے باوجود پارسی کبھی انگریزوں کی کٹھ پتلی نہ بنے تھے اور کانگریس کا ساتھ دیتے رہے تھے۔ اسی طرح بمبئی کے کامیاب وکیل بھولا بھائی ڈیسائی کا اپنی فرض شناسی اور حسن کارکردگی کی بنا پر مختصر مدت میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا ممبر بن جانا پرانے کانگریسیوں کے لیے رشک و حسد کا سبب بن گیا تھا۔ 1944 میں جب کانگریسی لیڈر جیلوں میں بند تھے اور گاندھی جی خرابی صحت کی بنا پر رہا کر دیے گئے تھے، بھولا بھائی ڈیسائی نے مسلم لیگ کے ڈپٹی لیڈر لیاقت علی کے ساتھ مرکزی اسمبلی میں کانگریس اور لیگ کے درمیان وقتی سمجھوتے کے لیے گفتگو شروع کر دی تھی۔ اگرچہ انھیں گاندھی جی کی تائید حاصل تھی لیکن 1945 میں کانگریسی لیڈر رہا ہوئے تو انھوں نے ڈیسائی کے خلاف محاذ بنایا اور انھیں لیگ کے ساتھ سازش میں ملوث قرار دے کر اس برس کے انتخابات میں امیدوار بھی نہیں بنایا گیا۔ ان کی اس حد تک کردار کشی کی گئی کہ وہ دل کے مرض میں مبتلا ہو کر جلد ہی گزر گئے۔ 1946 کی عبوری حکومت میں مولانا آزاد نے سردار کو صلاح دی تھی کہ کسی پارسی کو بھی کابینہ میں شامل کریں۔ مولانا اس انتہائی چھوٹی سی جماعت کی معاشی و معاشرتی آسودہ حالی اور ملک کی خدمات میں نمایاں حیثیت کے پیش نظر خاصے جذبات رکھتے تھے۔ سردار نے غیر ذمے داری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے بیٹے کے ایک دوست این سی بھابھا کو نام زد کر دیا تھا جو کسی بھی اعتبار سے پارسیوں کے نمائندے نہیں تھے اور ناموزوں ہونے کی بنا پر کابینہ میں نہ ٹک سکے تھے۔

بنگال کے کرن شنکر رائے اور کئی کانگریسی لیڈروں کو تقسیم ملک کے سمجھوتے کی یہ شق بہت دانشمندانہ لگی تھی کہ مجوزہ ہندوپاک میں ایک طرف کی اقلیت کے تحفظ کی ضمانت دوسری طرف کی اقلیت کی سلامتی سے مشروط ہوگی۔ گویا انھوں نے اپنی اپنی اقلیتوں کو یرغمال کی حیثیت دے دی تھی۔ رائے کی اپیل صدر کانگریس نے سنی نہ ہی سردار پٹیل نے۔ کرن شنکر رائے نے اپنی زندگی ہی میں اپنے اندیشوں کو خوں چکاں مناظر میں بدلتے دیکھا تھا اور آبدیدہ ہوتے رہے تھے۔

نہرو اور سردار دونوں ہی گاندھی جی کے قریب تھے اور ان میں کچھ نہ کچھ مساجت کا جذبہ بھی موجود تھا۔ 1950 کے کانگریس کے ناسک سیشن میں ان میں ٹکراؤ کی نوبت آ گئی تھی جب سردار نے کانگریس کی صدارت کے لیے مسلم دشمنی میں مشہور پرشوتم داس ٹنڈن کو نامزد کر دیا تھا۔ ٹنڈن، پنڈت نہرو کے لیے شخصی اور نظریاتی ہر اعتبار سے ایک ناپسندیدہ شخص تھے۔ انھوں نے نیتاً کم ناپسندیدہ اچاریہ کرپلانی کے نام پر مصالحت کرنا چاہی تھی۔ سردار نے ہوا کا رُخ جاننے کے لیے فخرالدین علی احمد اور دوسرے لیڈروں کے پاس مُجبر دوڑایا۔ اُن لوگوں کا رجحان نہرو کی حمایت میں دیکھ کر انھوں نے فخرالدین علی احمد سے کہا تھا کہ کیا تم لوگوں کی مت ماری گئی ہے؟ یاد رکھو نہرو وہ شخص ہے جو نہ کسی دشمن کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ کسی دوست کی مدد کر سکتا ہے۔ مگر میں نہ تو کبھی اپنے دوست کو بھولتا ہوں اور نہ ہی دشمن کو معاف کرتا ہوں۔" آخر ٹنڈن جیت گئے تھے اور نہرو کو سخت صدمہ ہوا تھا۔ جب ٹنڈن کی سوشلزم مخالف اور غیر رواداری پالیسیاں ان کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی تھیں تو نہرو نے ورکنگ کمیٹی سے استعفا دے دیا تھا۔ اُس وقت سردار کے بہی خواہوں نے انھیں اُکسایا تھا کہ وہ خود وزیراعظم بن جائیں۔ سردار بہر کیف حقیقت پسند تھے۔ انھوں نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ پارٹی میرے ساتھ ہے لیکن عوام نہرو کے ساتھ ہیں۔" آخر نہرو کے ہاں ورکنگ کمیٹی کے ممبران کے عدم تعاون کے اندیشے سے ٹنڈن نے اپنا استعفا دے دیا اور نہرو نے صدارت سنبھال لی۔ نہرو اور پٹیل میں بارہا تنازعات ابھرے، جب تک گاندھی جی حیات رہے ان میں صلح کراتے رہے۔ اُن کی موت کے بعد کسی حد تک یہ فرض ابوالکلام آزاد نے بھی نبھایا تھا۔

جب 1946 میں مولانا آزاد نے کانگریس کی صدارت چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا تو 16 میں سے 13 ریاستی تنظیموں کی حمایت سردار کو حاصل تھی لیکن مولانا نے نہرو کو ترجیح دی تھی اور گاندھی جی کو بھی ہمنوا بنایا تھا۔ اُس وقت سردار نے کشادہ دلی کے ساتھ نہرو کی تحریک پیش کر کے مولانا آزاد کی کانگریس کے صدر کی حیثیت سے انجام دی گئی خدمات کو سراہا تھا۔ سردار کو اس بات کا ہمیشہ افسوس رہا تھا کہ مسلمان گاندھی جیسے مخلص انسان کی بات نہیں سمجھتے تھے اور حیرت رہی تھی کہ مولانا آزاد جیسا راست باز اور عالم دین، جناح جیسے بے عمل اور صرف نام کے مسلمان کے اثر کو زائل کرنے میں کیوں ناکام رہا؟ وہ خان عبدالغفار خان کے زیادہ قائل تھے، جنھوں نے پٹھانوں میں جناح کو کبھی پنپنے نہیں دیا تھا اور ان کا صوبہ سرحد مسلم لیگ کے لیے ناقابل تسخیر رہا تھا۔

بقول راج موہن گاندھی سردار کی دنیا میں مسلمانوں کا کوئی گزر نہیں رہا سوائے اپنے کانگریسی ساتھیوں، علی برادران اور چند اور مسلمانوں کے۔ ایک بار گاندھی جی نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی تہذیب و روایات کو بہتر طریقے سے سمجھنے کے لیے اردو زبان سیکھ لیں۔ سردار نے اپنی بڑھتی عمر کا عذر کرتے ہوئے اُن پر یہ طنز کیا تھا کہ "آپ نے اردو سیکھ لینے سے کون سے خاطر خواہ نتائج نکلے ہیں! آپ جتنا ان کے قریب ہونے کی کوشش کرتے ہیں، وہ اتنا ہی آپ سے دور بھاگتے ہیں۔"

تقسیم کے بعد ہندستان میں اردو کی اہمیت کم ہوتی گئی۔ چوں کہ پاکستان نے اردو کو اپنی قومی زبان بنایا تھا اس لیے بھی یہاں کا عوامی مزاج اردو مخالف بن گیا تھا اور ہندی حکومت کی سرپرستی میں پھلنے پھولنے لگی تھی۔ سردار نشر و اشاعت اور معلومات عامہ کے بھی وزیر تھے۔ اردو زبان سے اگر ان کے تعصب کا کوئی ثبوت نہیں ملتا تو محبت کا بھی نہیں ملتا۔ ڈاکٹر ذکریا نے جو چند مثالیں پیش کی ہیں وہ ان کی اردو کی حمایت کی نہیں شکست خوردگی کی مظہر ہیں۔ وہ ملک کی زبان کے لیے گاندھی جی کی تقریروں کی زبان کو مثالی مانتے تھے۔ انھوں نے آل انڈیا ریڈیو میں سنسکرت آمیز ہندی کا استعمال کرنے والے ہوشیوں کی فہمائش کرتے ہوئے ایک بار آر آر دیواکر کو اپنے خط میں لکھا تھا کہ "آل انڈیا ریڈیو کی زبان عام فہم ہونی چاہیے، یہ کوئی ادبی مکتب نہیں ہے۔" اسی خط میں انھوں نے مشورہ دیا تھا کہ "آل انڈیا ریڈیو کی نشریات کا کچھ حصہ اردو میں بھی اور مسلمانوں اور پناہ گزینوں میں سیکولر تہذیب و ثقافت کو عام کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔" سردار کی ایما پر ہی کشن ڈوچن سے جریدہ "آج کل" جاری ہوا تو مقصد یہی تھا کہ حب الوطنی اور قومی ہم آہنگی کے جذبات کو فروغ دیا جائے جیسا کہ انھوں نے جوش کو مشورہ دیا تھا۔ جوش کو سروجنی نائیڈو کی سفارش پر اڈیٹر بنایا گیا تھا لیکن

اُن کی تقرری سے پہلے سردار نے اپنے سکریٹری وی شنکر کی زبانی جوش کی نظمیں سُن کر اُن کے فکری پہلو سے اپنی تسلی کر لی تھی اور وہ جوش کی انقلابی اور وطنی جذبے کی نظمیں سُن کر واقعی بہت خوش ہوئے تھے۔

کانگریسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ڈاکٹر ذکریا کی کتاب کا 75% حصہ سردار پر لگے فرقہ پرستی کے الزامات کی صفائی میں صرف ہوا ہے۔

سردار کی رواداری کی مثال میں ذکریا نے لکھا ہے کہ انھوں نے فسادات کے دنوں میں بھی دہلی کے مسلم چیف کمشنر خورشید احمد کو اُن کے عہدے پر برقرار رکھا تھا۔ جب کہ مولانا آزاد کے بھوجب صاحب زادہ آفتاب احمد کے صاحب زادے خورشید احمد محض نام کے افسر اعلا تھے۔ کہیں اُن پر مسلمانوں کی طرف داری کا الزام نہ لگ جائے، اس ڈر سے انھوں نے فساد روکنے کے ضروری قدم بھی نہ اُٹھائے تھے۔

1949 میں جب اترپردیش میں گووند ولبھ پنت وزیراعلا تھے، بابری مسجد میں رام کی مورتی رکھ دی گئی تھی۔ ڈاکٹر ذکریا نے پنت کے نام لکھے سردار کے اس پیغام کو بھی کافی سراہا ہے کہ "اگر ہم اس معاملے میں کسی خاص گروہ کی طرف داری کرتے ہیں تو یہ ہماری بڑی بدقسمتی ہوگی۔" لیکن انھوں نے خط کے ان سطور پر غور نہیں کیا جس میں "طے شدہ امور" کو بھی اقلیتوں کو پرچار کر حل کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ اس واقعے کے تناظر میں بھاجپا کو لتاڑتے ہوئے ذکریا نے لکھا ہے کہ "جمہوریت اور سیکولرزم کے عہد جدید میں فاشسٹوں نے بابری مسجد کو بیٹھکی سمیع و اطلاع کے ساتھ دن کے اُجالے میں منہدم کر کے ملک اور قوم کا وقار ملیامیٹ کر دیا تھا۔" لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ کانگریس تک نے کیوں اس ودھیم پر کیے گئے عمل کا ارتقا تھی اور مشہور صحافی شمس کنول کے لفظوں میں اُن کی دائیں بازو کی جڑیں ہے مل گیا تھا۔"

گاندھی جی نے دہلی میں مسلمانوں کی ہلاکتوں کے لیے سردار کو ذمے دار مانا تھا اور اُن کی بے عملی کو دیکھ کر انھیں فسادات رکوانے کے لیے اپنی خفیہ میں برت رکھنا پڑا تھا۔ کچھ دنوں بعد جب گاندھی جی قتل کر دیے گئے تو جے پرکاش نرائن نے اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہندستان کا وزیرداخلہ اس قتل کی ذمے داری سے بچ نہیں سکتا۔ جب گاندھی جی کے خلاف کھلے عام زہریلا پروپیگنڈا ہو رہا تھا اور اُن کی پرارتھنا سبھا میں ایک بم پھینکا بھی جا چکا تھا تو اُن کے تحفظ کا خاص انتظام کیوں نہیں کیا گیا؟"

آج اس بات کا ذکر ایک کارنامے کی طرح کیا جاتا ہے کہ سردار پٹیل نے آر ایس ایس پر پابندی عائد کر دی تھی۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر ایسا بھی نہ کیا جاتا تو اس سے بڑی نااہلی اور کیا ہوتی! طرفہ تماشا یہ کہ صرف 17-16 ماہ میں کانگریس اس یقین دہانی پر پابندی ہٹالی گئی تھی کہ اس تنظیم کی سرگرمیاں تہذیب و ثقافت تک محدود رہیں گی۔ وہ ملک کے دستور کی پابند ہوگی اور قومی پرچم کا احترام کرے گی۔ (15 دسمبر 1950 کو) سردار کی آنکھیں مُند تے ہی اس تنظیم نے اپنے عہد کی دھجیاں اس طرح اُڑائیں کہ 26 جنوری 2002 تک 52 برسوں میں اپنے ہیڈ کوارٹرز 'اسمرتی بھون' (ناگپور) پر کبھی قومی پرچم نہیں لہرایا اور وہاں آج بھی گاندھی جی کے قاتل گوڈسے کو ایک شہید کی طرح یاد کیا جاتا ہے۔

آزادی کے بعد سردار مسلم لیگ کی فرقہ پرستی کا عملی جواب ثابت ہوئے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں پر اعتبار نہ کرنے کی پالیسی اپنائی تھی، اس لیے کہ وہ انھیں تقسیم کا ذمے دار سمجھتے تھے۔ انھوں نے 'پرمٹ سسٹم' کے ذریعے 15 اگست 1947 سے قبل پاکستان گئے ہر ہندستانی مسلمان کی ہندستانی شہریت ختم کر دی تھی، چاہے وہ سیر و تفریح کے لیے یا کسی رشتے داری کے پاس کیوں نہ گیا ہو۔ اس کے علاوہ 'قانون تخلیہ جائیداد' کو نافذ کر کے ہندستان سے جانے والے مسلمانوں کے کاروبار، صنعتیں، دکانیں، زمینیں ہر طرح کی منقولہ غیر منقولہ جائیداد ضبط کر کے انھیں تباہی کے غار میں دھکیل دیا تھا۔ پھر بھی انھیں اس بات کی خلش رہی تھی کہ اس سے دس گنا جائیدادیں ہندوؤں اور سکھوں کی پاکستان نے ہڑپ کر لی ہیں۔ ڈاکٹر ذکریا نے لکھا ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کی اس تباہی کے ذمے دار بھی جناح تھے جن کی زندگی ہی میں پاکستان نے ان سیہ قوانین کے نفاذ کی پہل کی تھی۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ مذہبی انتہا پسندی کے اس عہد میں سردار پر بھی فرقہ پرستی کا رنگ چڑھ رہا تھا۔ بقول راج موہن گاندھی انھیں پچاس مسلمانوں کی موت پر اتنا غم نہ ہوتا تھا جتنا پانچ ہندوؤں یا سکھوں کی موت پر!

نہرو کی بار بار کی فہمائش اور

مسلمانوں سے ہمدردی پر خفا ہو کر انھوں نے ایک بار کہہ دیا تھا کہ ہندستان میں صرف ایک محب وطن مسلمان ہے اور وہ نہرو ہے۔" یہ فقرہ آگ کی طرح پھیل گیا تھا اور گاندھی جی نے پریشان ہو کر انھیں متنبہ کیا تھا کہ وہ اپنی ذہانت کی نمائش میں اتنے بے احتیاط نہ ہوں۔" لیکن انھوں نے گاندھی جی کو بھی نہیں بخشا تھا اور اُن کی بار بار کی تنبیہوں پر یہ گستاخانہ جواب دیا تھا: "مسلمانوں کے ساتھ نرمی برتنے کی وجہ سے آپ کا دماغ چل گیا ہے۔"

شمس کنول نے اُن کے بارے میں لکھا تھا کہ سردار سیاست داں ہونے کے باوجود دو ٹوک اور ریا کار نہ تھے، اس لیے اُن کا یہ کہنا مسلمانوں کو برا لگتا تھا کہ جن مسلمانوں کو ہندستان سے زیادہ پاکستان عزیز ہے اُن کو چاہیے کہ وہ پاکستان چلے جائیں۔"

پھر انھیں کچھ واقعات اور ساتھیوں کے تجربوں نے بھی سخت گیر بنا دیا تھا۔ جب سردار کو بتایا گیا کہ حیدرآباد کے مسلمانوں نے لائق علی (نظام حیدرآباد اور قاسم رضوی کے قریبی ساتھی) کے پولس کی نگرانی سے نکل بھاگنے کا جشن منایا ہے تو انھوں نے کہا تھا "کیا مسلمانوں کو اس بات کا احساس نہیں ہے کہ اُن کا مستقبل ہندستان سے وابستہ ہے۔" اس کے علاوہ ڈاکٹر سید محمود، ہندستانی قضائیہ کے ایک بیک ورڈ مسلمان افسر اعلا اور چودھری خلیق الزماں جیسے لوگوں کے کردار و عمل نے بھی اُن کے مزاج کو عدم رواداری کی طرف پھیر دیا تھا۔

ڈاکٹر سید محمود جو کانگریس کے ایک ممتاز لیڈر اور 'ہندستان چھوڑو' تحریک کے گرفتاروں میں سے تھے۔ احمد نگر کی اسیری میں انھوں نے اپنے آزاد اور نہرو جیسے ساتھیوں سے چھپا کر وائسرائے کو خط لکھا تھا اور تحریک سے اپنی علاحدگی کا یقین دلا کر اپنی رہائی کا سودا کر لیا تھا۔ اُن کی رہائی کا راز کھلنے پر سردار نے کہا تھا کہ "اگر انھوں نے یہ نہ کیا ہوتا اور مر گئے ہوتے تو ہم اُن کی زندگی کو خوش گوار ڈھنگ سے یاد رکھتے۔" اس کے علاوہ ہندستان میں رہ گئے مسلم لیگ کے قد آور لیڈر چودھری خلیق الزماں نے 15 اگست کو ہندستان کی پارلیمنٹ میں ہندستان سے اپنی وفاداری کا ایسا جذباتی اظہار کیا تھا کہ پنڈت نہرو نے اٹھ کر انھیں گلے لگا لیا تھا۔ کچھ دنوں بعد وہ ایک خیرسگالی

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

# اردو دُنیا

## مہاراشٹر کے 6 اضلاع میں اردو گھروں کی تعمیر

ممبئی (۱۳ فروری)۔ اب حکومت مہاراشٹر کی اقلیتی وزارت نے ریاست کے 6 اضلاع میں اردو گھر (کمپلیکس) تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس عمل کا آغاز ریاست کے ناندیڑ شہر سے ہونے والا ہے، جہاں پہلے اردو گھر کا سنگ بنیاد رکھا جائے گا۔ اقلیتی امور کے وزیر محمد عارف نسیم خاں نے آج یہ باتیں اخبار نویسوں کو بتائیں اور کہا کہ ناندیڑ کے علاوہ ممبئی، اورنگ آباد، ناگپور، مالیگاؤں اور شولاپور میں بھی جلد ہی اس کی تعمیراتی سرگرمیوں کا آغاز عمل میں آئے گا۔ ناندیڑ کے اردو گھر کی تفصیلات بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ڈیڑھ ایکڑ قطعہ اراضی پر تعمیر ہونے والے اس اردو گھر کو منفرد طرح تعمیر کیا جائے گا اور اس کی تعمیر کے لیے ماہر آرکیٹیکٹ کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جو اسے فن تعمیر کے نمونے سے کچھ اس طرح تعمیر کریں گے کہ اس کی ایک جھلک دیکھنے سے ہی ایک عام آدمی کو زبان اردو کی محبت اور امن کا گہوارہ ہونے کی نشانی محسوس ہوگی۔ وزیر اقلیتی امور نے مزید کہا کہ اس اردو گھر میں ایک 500 نشستوں پر مشتمل آڈیٹوریم بھی ہوگا جہاں مختلف تقاریب کا اہتمام کیا جائے گا، ساتھ ہی اس میں ایک لائبریری بھی ہوگی جہاں نادر و نایاب کتابوں سے لے کر عصر حاضر تک کی کتابیں دستیاب کرائی جائیں گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس کمپلیکس میں دو کلاس روم بھی تعمیر کیے جائیں گے جہاں طلبہ و طالبات بیٹھ کر مطالعہ کریں گے، خاص طور پر ریسرچ کرنے والے طلبہ کے لیے یہ انتہائی مفید ثابت ہوگا۔ شعرا، ادبا، مصنفین اور اردو صحافیوں کے لیے تین کمروں پر مشتمل قیام گاہ بھی تعمیر کی جائے گی جہاں ان کے قیام کے بہترین انتظامات کیے جائیں گے۔ نسیم خاں نے کہا کہ آٹھ کروڑ سولہ لاکھ روپے کی لاگت سے تیار ہونے والے اس اردو گھر کے سنگ بنیاد کی تقریب میں سابق وزیر اعلا اشوک چوہان، نگراں وزیر ڈی پی ساونت، مقامی رکن پارلیمنٹ بھاسکر راؤ کھتگاؤنکر بھی شامل ہوں گے۔ (راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

## آل انڈیا ریڈیو گورکھپور سے اردو پروگرام نشر کرنے پر تحریک کا انتباہ

کشی نگر، یوپی (۱۶ فروری)۔ آل انڈیا ریڈیو گورکھپور مرکز سے گزشتہ ڈیڑھ سال سے اردو پروگرام نشر نہ کیے جانے سے مشتعل محبان اردو نے ایک درجن رجسٹرڈ ڈاک سے متعلقہ محکمہ اطلاعات و نشریات کے محکمے کو ارسال کیا ہے۔ قومی فلاحی تنظیم کے ڈائرکٹر قاری محمد غیاث الدین خاں، عرفان احمد، سیرت ایجوکیشنل ٹرسٹ کے صدر ماسٹر محمد نسیم قریشی اشرفی، بزم دانش میراج گنج کے صدر ساحل مصباحی اور قاری محمد جلال الدین قادری نے حکومت کو خط ارسال کرکے الزام عائد کیا ہے کہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے ریڈیو اسٹیشن گورکھپور سے ایک بھی نیا پروگرام نشر نہیں کیا گیا۔ بھی کسی خاص موقعے پر پرانے ریکارڈ کیے گئے پروگرام کو دوبارہ نشر کر دیا جاتا ہے۔ ریڈیو اسٹیشن کے ذمہ داران سے رابطہ کرنے پر بتایا جاتا ہے کہ بجٹ نہ ہونے کے سبب نئے پروگرام نہیں ہو رہے ہیں جب بجٹ آجائے گا تو نئے پروگرام ریکارڈ کیے جائیں گے۔ مذکورہ تنظیموں سے وابستہ ذمہ داران نے حکومت سے سوال کیا ہے کہ کیا صرف اردو کے لیے سرکاری خزانے خالی ہیں۔ کئی سال گزر جانے کے باوجود نئے پروگرام نشر نہ کیا جانا نہایت افسوس کی بات ہے جب کہ اگر دیکھا جائے تو لاکھوں روپے ماہانہ ریڈیو اسٹیشن کو اشتہارات کے ذریعے موصول ہوتے ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

## جھارکھنڈ اردو اکیڈمی کے قیام کے معاملے کو اسمبلی میں اٹھائیں

رانچی (۱۹ فروری)۔ ادارۂ شرعیہ جھارکھنڈ کے ناظم اعلا مولانا قطب الدین رضوی نے کہا ہے کہ جھارکھنڈ کی تشکیل کو چودہ برس ہو چکے ہیں لیکن آج تک جھارکھنڈ اردو اکیڈمی کی تشکیل نہیں ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو حلقے کی جانب سے مسلسل اردو اکیڈمی کی تشکیل کا مطالبہ کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن حکومت اس سمت میں کوئی کارروائی نہیں کر رہی ہے۔ آئندہ بجٹ سیشن میں حکومت کو چاہیے کہ جھارکھنڈ اردو اکیڈمی کی تشکیل کا اعلان کرے۔ خاص طور سے چاروں مسلم ممبران اسمبلی حاجی حسین انصاری، سرفراز احمد، نظام الدین انصاری اور منان ملک کو چاہیے کہ اس معاملے کو موثر طریقے سے اسمبلی میں اٹھائیں اور حکومت پر اکیڈمی کی تشکیل کے لیے دباؤ ڈالیں۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

## اردو میڈیم مدارس کے طلبہ کو دو سال سے اسکالرشپ کی عدم منظوری

حیدرآباد (۱۳ فروری)۔ آل انڈیا اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن آندھرا پردیش (سوٹا) کے قائدین محمد انوار الباقی، محمد عبدالعلیم، محمد عبدالجبار الفروز، ساجد محی الدین، نورالدین قادری، محمد عبدالقدیر صدیقی، محمد خواجہ معین الدین اور خواجہ فاروق الدین وہاج نے مشترکہ بیان میں کہا کہ سابق میں ریاست کے اردو میڈیم مدارس کے طلبہ و طالبات کو اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی جانب سے اسکالرشپس کی اجرائی عمل میں آتی تھی، مگر کچھ عرصہ قبل مائناریٹی فائنانس کارپوریشن کو تفویض کی گئی اور ریاست کے اردو میڈیم مدارس کے طلبہ و طالبات دو سال سے درخواست داخل کرنے کے باوجود اسکالرشپس سے محروم ہیں۔ انھوں نے کہا کہ طلبہ و طالبات کی جانب سے صداقت نامہ آمدنی اور فارم آن لائن کرنے کے باوجود عدم منظوری سے طلبہ میں بے چینی ہے۔ صدر ریاستی اقلیتی کمیشن سے مطالبہ ہے کہ ان امور پر توجہ دیں اور جماعت دوم تا دہم کے طلبہ و طالبات کے لیے اسکالرشپس کی منظوری کو یقینی بنائیں۔

(اعتماد، حیدرآباد)

## منور رانا یوپی اردو اکادمی کے صدر اور نواز دیوبندی چیئرمین مقرر

لکھنؤ (۱۵ فروری)۔ یوپی اردو اکادمی کی تشکیل کے لیے ہائی کورٹ سے گزشتہ ۳۰ جنوری کو ایک مہینے کا وقت ملنے کے بعد ریاستی حکومت نے اردو اکادمی میں صدر اور چیئرمین کی نامزدگی کر دی ہے۔ مشہور شاعر منور رانا کو صدر اور نواز دیوبندی کو چیئرمین نامزد کیا گیا ہے۔ سرکاری ذرائع نے بتایا کہ ان دو ناموں پر وزیر اعلا کی منظوری ہو گئی ہے جب کہ ممبران کی نامزدگی کی کارروائی جاری ہے۔ یاد رہے کہ مفاد عامہ کی ایک عرضی پر ہائی کورٹ کی طرف سے حکومت کو توہین عدالت کا نوٹس جاری ہونے کے بعد سرکاری وکیل نے گزشتہ ۳۰ جنوری کو ہائی کورٹ کو بتایا تھا کہ ناموں کا انتخاب ہو گیا ہے اور ایک مہینے کے اندر اردو اکادمی کی تشکیل ہو جائے گی۔ اس پر فاضل جج نے کہا تھا کہ اگر اس یقین دہانی پر بھی عمل نہیں ہوا تو پرنسپل سکریٹری (بھاشا) ۲۳ مارچ کو عدالت میں حاضر ہو کر تاخیر کی وجہ بتائیں۔ توہین عدالت کے معاملے میں جسٹس ایس این شکلا کے تحت حکم کے بعد حکومت حرکت میں آگئی۔

قابل ذکر ہے کہ سماج وادی پارٹی نے مارچ ۲۰۱۲ء میں حکومت قائم ہونے کے بعد جب ڈیڑھ سال کی مدت میں یوپی اردو اکادمی کی تشکیل نہیں کی تو ہائی کورٹ کے وکیل فاروق احمد نے ستمبر ۲۰۱۳ء میں اس بارے میں مفاد عامہ کی عرضی داخل کی تھی۔ انھوں نے لسانیات کے پرنسپل سکریٹری کو اردو اکادمی کے ضابطوں کے خلاف اس کا نائب صدر مقرر کیے جانے پر اعتراض کیا۔ عدالت نے اس کی وجہ بھی حکومت سے پوچھی۔ تقریباً پانچ مہینے تک عدالتی کارروائی کے بعد حکومت حرکت میں آئی ہے۔ فاروق احمد ایڈوکیٹ نے انقلاب سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اگر عدالتی کارروائی نہ کی جاتی تو حکومت پانچ سال کی مدت بغیر اکادمی کی تشکیل کے نکال دیتی۔ انھوں نے کہا کہ ریاستی حکومت نے ضابطوں کے خلاف ایک سرکاری افسر کو اکادمی کا نائب صدر مقرر کرکے اپنے ارادے ظاہر کر دیے تھے۔

(انقلاب۔ دہلی)

## بارابونی (مغربی بنگال) کے واحد اردو پرائمری اسکول کی حالت زار

بارابونی، مغربی بنگال (۲۰ فروری)۔ بارابونی بلاک کے پانوریا میں واقع واحد اردو پرائمری اسکول کو جونیئر ہائی اسکول کا درجہ دلانے پر زور دینے کی غرض سے مذکورہ اسکول کے ہیڈ ٹیچر ایس ایم شاکر نے ایک میٹنگ منعقد کی، جس میں اساتذۂ کرام، گارجین کے علاوہ بارابونی اسمبلی حلقے کے ایم ایل اے بدھان اپادھیائے، بارابونی بلاک ترنمول کانگریس کے صدر اسیش داس نے شرکت کی۔ اس اسکول کے معاون مدرس اشفاق احمد کے مطابق بارابونی بلاک کے اس واحد اردو میڈیم پرائمری اسکول کو سرکاری منظوری ۲۰۰۲ء میں ملی۔ درجہ چہارم تک کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۲۰۰۶ء میں اس اسکول سے پہلا اردو میڈیم بیچ نکلا۔ اس بلاک میں کوئی اور دوسرا پرائمری یا جونیئر ہائی اسکول نہیں ہونے کی وجہ سے ۲۰۰۷ء میں اسی اسکول کو درجہ ہشتم تک تعلیمی سہولت فراہم کرائی گئی اس امید پر کہ آنے والے سالوں میں اسے درجہ بہ درجہ ترقی دیتے ہوئے جونیئر ہائی اسکول کی شکل دی جائے گی مگر افسوس کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ اس پورے بلاک میں اردو جونیئر ہائی اسکول کی عدم موجودگی کی وجہ سے طلبہ کے سرپرست اپنے بچوں کو اردو میڈیم کی تعلیم دلانے سے گریز کرنے لگے۔ اب تو حالت یہ ہے کہ پہلے جہاں اس اسکول میں تقریباً 250 بچے اور 15 اساتذۂ کرام تھے ۲۰۱۴ء میں بچوں کی تعداد گھٹ کر 60 ہو گئی ہے اور اساتذۂ کرام کی تعداد بھی 5 سے گھٹ کر 2 ہو گئی ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو آنے والے دنوں میں اس بلاک کا واحد اردو میڈیم اسکول تاریخ کا حصہ بن کر رہ جائے گا۔ اسے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ اس پرائمری اسکول کو فوراً جونیئر ہائی اسکول کا درجہ دیا جائے تاکہ پرائمری کی تعلیم کے بعد بچوں کو آگے کی تعلیمی سہولت اپنی مادری زبان میں حاصل ہو سکے۔

(اخبار مشرق، کلکتہ)

## عربی و فارسی کو یو پی ایس سی میں بحال کرنے کے لیے مہم کا آغاز

نئی دہلی (۱۳ر فروری)۔ عربی و فارسی کو یو پی ایس سی میں دوبارہ بحال کرنے کے لیے طلبا اور اساتذہ کے بار بار احتجاج کے باوجود کوئی ایکشن نہ لینے پر ایک بار پھر جواہر لال نہرو اسٹوڈنٹس یونین نے اس سلسلے میں اپنی مہم کا آغاز کردیا ہے۔ اکبر چودھری نے بتایا کہ آج ہم نے آئی ٹی او پر واقع گاندھی پیس فاؤنڈیشن میں اس مہم کو زور و شور سے اٹھانے کے لیے ایک پروگرام منعقد کیا ہے، جس میں کئی دانشوران اور سیاست داں شرکت کر رہے ہیں۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے استاذ ڈاکٹر قطب الدین نے بتایا کہ ہم نے یو پی ایس سی میں عربی، فارسی کو بحال کرانے کے لیے بڑی کوششیں کی ہیں، مگر اس کے باوجود یو پی ایس سی افسران کا اس طرف متوجہ نہ ہونا نہایت افسوس ناک بات ہے۔ یہ زبانیں ہندوستان کی تاریخ و تہذیب میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں، اس کے باوجود ان زبانوں سے صرف نظر کرنا خود ہندوستانی تاریخ اور یہاں کی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ان دیکھی کرنا ہے۔

(انقلاب۔ دہلی)

## خالد مسعود فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کے چیئرمین نامزد

لکھنؤ (۱۳ر فروری)۔ باندہ سے تعلق رکھنے والے خالد مسعود کو یوپی حکومت نے فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کا چیئرمین نامزد کیا ہے۔ خالد صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہیں اور یونیورسٹی طلبہ یونین کے صدر اور نائب صدر رہ چکے ہیں۔ خالد مسعود کی تقرری غیر سرکاری ممبر اور صدر کے طور پر ایک سال کے لیے کی گئی ہے۔ کمیٹی کے سکریٹری ایس رضوان نے بتایا کہ ایگزیکیو کمیٹی میں تین غیر سرکاری ممبران کی بھی نامزدگی کی گئی ہے۔ کمیٹی میں با اختیار عہدے سات سرکاری ممبران شامل ہوتے ہیں۔ فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی اردو زبان و ادب اور قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے ۱۹۷۶ء میں تشکیل کی گئی تھی۔ اس کے خاص منصوبوں میں مسودات کی اشاعت کے لیے امداد، اردو ریسرچ اسکالرس کی مدد کرنا، ایم اے اردو کے ٹاپرس کو میڈل اور نقد رقم بطور ایوارڈ دینا اور قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے مختلف پروگرام منعقد کرنا شامل ہے۔ یو پی اردو اکادمی کے برعکس فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کا دائرۂ کار پورا ہندوستان ہے، تاہم اس کا سالانہ بجٹ صرف پچاس لاکھ روپے ہے جو اس کے مقاصد کو دیکھتے ہوئے بہت کم ہے۔ سابق صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد کے نام پر قائم اس ادارے کی علاحدہ بلڈنگ کے لیے ۲۰۰۹ء میں ایک تجویز یوپی حکومت کو ارسال کی گئی تھی لیکن ابھی تک اس پر آگے کوئی کام نہیں ہوا۔

(انقلاب۔ دہلی)

## اسسٹنٹ اردو ٹیچرز کے عہدے کے لیے

### ۲۱ر فروری سے ۱۵ر مارچ تک آن لائن رجسٹریشن کرنا ہوگا

لکھنؤ (۱۳ر فروری)۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ کے حکم کے مطابق حکومت اتر پردیش کے ذریعے ادیب، مولوی اور منشی کو ہائی اسکول اور عالم کو انٹرمیڈیٹ کے مساوی تسلیم کیے جانے کے بعد بیسک شکشا پریشد محکمے کی طرف سے اسسٹنٹ اردو ٹیچر کے عہدے کے لیے الگ الگ اضلاع میں خالی عہدوں پر اشتہار جاری کرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ سرکاری اطلاع کے مطابق آن لائن درخواست کا خاکہ بیسک شکشا پریشد کی ویب سائٹ http://upbasiceduparishad.gov.in پر ۲۱ر فروری سے ۱۵ر مارچ ۲۰۱۴ء تک رات بارہ بجے تک دستیاب رہے گا۔ امیدواروں کو پہلے ویب سائٹ پر رجسٹریشن کرا کے ضروری معلومات بھرنی ہوں گی۔ اس کے بعد ای چالان کے ذریعے اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی برانچ میں سکریٹری یوپی بیسک شکشا پریشد کے نام پر مطلوبہ فیس جمع کرکے ای چالان آئی ڈی/ جرنل نمبر حاصل کرنا ہوگا۔ جرنل نمبر حاصل کرنے کے دو ورکنگ ڈے کے بعد پھر اسی ویب سائٹ پر مقررہ خاکہ کو بھرنا ہوگا۔ بھرے ہوئے فارم کا پرنٹ آؤٹ نکالنا لازمی ہے۔ اسسٹنٹ اردو ٹیچر کے سلیکشن کے لیے اہلیت اور دیگر شرطیں ۱۷ر اگست ۲۰۱۳ء کو جاری سرکاری حکم نامے کے مطابق رہیں گی۔

(انقلاب۔ دہلی)

## اردو کتابوں کے سلسلے میں لاپروائی

علی گڑھ (۱۷ر فروری)۔ تقریباً آٹھ سال سے پی آر ڈی کے اہلم پور میں خراب ہو رہی ڈھائی لاکھ اردو کتابوں کا معاملہ اسمبلی تک پہنچ گیا ہے۔ اس معاملے میں آر ایل ڈی کے لیڈر نے بنیادی تعلیم کے وزیر سے اردو کتابوں سے متعلق ہوئی لاپروائی کے لیے ذمہ دار افسران پر ہوئی کارروائی سے متعلق سوال کیا ہے۔ واضح ہو کہ ۲۰۰۶-۰۷ء میں اس وقت کے بی ایس اے الطاف انصاری نے پہلی سے آٹھویں کلاس تک کی اردو کی کتابیں ضرورت سے زیادہ منگالی تھیں۔ اردو پڑھنے والے بچوں کو تقسیم کرنے کے باوجود تین لاکھ کتابیں بچ گئیں۔ انھیں اگلے سال تقسیم کے لیے اہلم پور واقع پرائمری اسکول میں رکھوایا گیا۔ اس درمیان الطاف انصاری کا تبادلہ ہوگیا۔ نئے افسر یہاں رکھی کتابیں تقسیم کرانا بھول گئے۔ اقتدار بدلا تو نئی حکومت نے اردو کی کتابیں نہیں بھیجیں۔ ڈیڑھ کروڑ کی قیمت کی یہ کتابیں اب آؤٹ آف کورس ہوچکی ہیں۔

(انقلاب۔ دہلی)

# اردو میڈیم طلبہ کے ساتھ ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ کی جانبداری برقرار

### کئی مضامین کا اسٹڈی میٹیریل اردو میں مہیا نہیں کرایا گیا، گیارہویں کا اردو زبان کا پرچہ بھی نہیں آئے گا

نئی دہلی (۱۹ر فروری)۔ دہلی سرکار کے محکمہ تعلیم کا اردو میڈیم اسکولوں اور ان کے طلبہ کے ساتھ جانبدارانہ رویہ ہنوز برقرار ہے۔ گزشتہ سال زبردست مخالفت اور تنقید کے باوجود ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ نے اس بار پھر اردو میڈیم کے طلبہ کے لیے امتحانات کی تیاری کے لیے مہیا کرائے جانے والا زیادہ تر مضامین کا اسٹڈی میٹیریل (اوپن ٹسٹ بیسڈ اسسمنٹ) اردو کے بجائے انگریزی میں مہیا کرایا ہے جس کی وجہ سے اردو میڈیم کے طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ کو بھی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

واضح ہو کہ دہلی سرکار ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ امتحانات سے قبل طلبہ کو تیاری کے لیے اسٹڈی میٹیریل مہیا کراتا ہے۔ یہ میٹیریل انگریزی میڈیم کے طلبہ کے لیے انگریزی میں اور ہندی میڈیم کے طلبہ کے لیے ہندی میں مہیا کرایا جاتا ہے لیکن جب اردو میڈیم کے طلبہ کی بات آتی ہے تو انھیں کبھی انگریزی تو کبھی ہندی کا میٹیریل پکڑا دیا جاتا ہے۔ اس معاملے پر گزشتہ سال بھی ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ کافی تنقید کا نشانہ بنا تھا لیکن اس مرتبہ بھی اس نے سبق نہیں سیکھا اور اس بار پھر اردو میڈیم کے طلبہ کو حسب سابق نظرانداز کیا گیا ہے اور کئی مضامین کا اسٹڈی میٹیریل انگریزی میں ہی بھیجا گیا ہے، جس سے طلبہ میں کافی مایوسی اور اساتذہ میں بے چینی ہے۔

اس اطلاع کے ملنے کے بعد جب روزنامہ راشٹریہ سہارا نے اس تعلق سے مزید معلومات حاصل کی تو پتہ چلا کہ اس بار بھی جغرافیہ، ہوم سائنس، سوشیولوجی، ریاضی اور اردو زبان کا اسٹڈی میٹیریل اردو میں مہیا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اکنامکس، تاریخ اور پولیٹکل سائنس کا میٹیریل اردو میں موجود ہے۔ تمام مضامین کا میٹیریل اردو میں کیوں موجود نہیں ہے، اس کا جواب کوئی دینے کو تیار نہیں ہے۔ اس سلسلے میں جب ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ سے رابطہ قائم کیا گیا تو بتایا گیا کہ یہ اسٹڈی میٹیریل ڈائرکٹوریٹ کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔ جب ان سے سوال کیا گیا کہ ویب سائٹ پر ہی کیوں؟ طلبہ کو ہارڈ کاپی کیوں مہیا نہیں کرائی گئی تو اس کا کوئی معقول جواب نہیں ملا۔ ظاہر ہے کہ ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ کی اس لاپروائی یا سرد مہری کے سبب اردو میڈیم کے دسویں اور گیارہویں کے طلبہ کو امتحانات کی تیاری میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس کے علاوہ دہلی سرکار کے اسکولوں میں پانچویں کلاس سے لے کر گیارہویں کلاس تک کے امتحانات جمعرات سے شروع ہو رہے ہیں۔ یہاں بھی ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ نے اردو کے تئیں اپنی مجرمانہ غفلت کا ثبوت دیتے ہوئے گیارہویں جماعت کا اردو کا سوال نامہ دینے سے انکار کرتے ہوئے اسکولوں کو ہدایت دی ہے کہ وہ اپنے اسکول کا پرچہ خود اپنی ہی سطح پر تیار کرلیں۔ اس کے علاوہ جغرافیہ کا پرچہ بھی اردو میں مہیا نہیں کرایا جا رہا ہے۔ اردو میڈیم کے طلبہ کے لیے یہ پرچہ بھی ہندی میں آئے گا اور اسکول کے اساتذہ کو خود اس کا ترجمہ کرکے طلبہ کو دینا پڑے گا۔

اس سلسلے میں تعلیمی کاز کے لیے سرگرم این جی او ’’نوائے حق‘‘ کے صدر اسد غازی کا کہنا ہے کہ ہندی میڈیم کے طلبہ کے لیے ریاضی کا اسٹڈی میٹیریل انگریزی میں آیا تھا جس کی اسکول پرنسپل نے مخالفت کی تو ڈائرکٹوریٹ نے حساب کا پرچہ ہندی میں تیار کرکے بھیج دیا۔ جب ڈائرکٹوریٹ یہ پرچہ ہندی میں تیار کرا سکتا ہے تو اسے اردو سے کیا پرہیز ہے؟ اور اس نے ریاضی کا پیپر اردو میں کیوں مہیا نہیں کرایا؟ انھوں نے کہا کہ وہ اس سلسلے میں دہلی سرکار میں درخواست دے کر پہلے ہی گزارش کرچکے ہیں کہ اردو میڈیم کے طلبہ کے لیے اسٹڈی میٹیریل اردو میں ہی مہیا کرایا جائے۔ اس کے باوجود ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ کی بے حسی اردو کے تعلق سے اس کے متعصبانہ رویے کی غماز ہے۔

ذاکر حسین میموریل سینئر سیکنڈری اسکول جعفرآباد کے پرنسپل ڈاکٹر محمد معروف نے بتایا کہ کچھ مضامین کا میٹیریل اردو میں ہے اور کچھ کا نہیں ہے۔ انھوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ گیارہویں کلاس کے لیے اردو زبان اور جغرافیہ کے سوال نامے اردو میں نہیں آئیں گے اور اردو کا پرچہ اسکولوں سے خود تیار کرنے کو کہا گیا ہے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

## بائیس سال گزر جانے کے باوجود ملت اردو ہائی اسکول منظوری سے محروم

سہسرام، بہار (۱۰ر فروری)۔ شہر میں اقلیت کے دو اسکول ہیں، سہسرام مسلم گرلس مڈل اسکول اور ملت اردو ہائی اسکول۔ ان دونوں اسکولوں کی اپنی اہمیت ہیں۔ سہسرام مسلم گرلس مڈل اسکول حکومت اور ضلع محکمہ تعلیم کی بے توجہی کا شکار ہے۔ ملت اردو ہائی اسکول کی بنیاد ۱۹۶۸ء میں رکھی گئی، اس اسکول کی بھی اپنی عمارت ہے، ماہر اساتذہ بچوں کے مستقبل کو چمکانے میں سرگرم ہیں، مگر اسکول پر حکومت کی کوئی توجہ نہیں ہے۔ ۱۹۹۱ء میں ملت اردو ہائی اسکول نے محکمے کو منظوری کے لیے بھی کاغذات جمع کردیے مگر 22 سال سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اسکول کو منظوری نہیں مل سکی، حالاں کہ اسکول کو محکمہ نے گزشتہ سال ارسال کیا ہے جس کا نمبر 74519 ہے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر عبدالمنان نے بتایا کہ حکومت کی جانب سے کوئی امداد مہیا نہیں کرائی جاتی ہے۔ جس طرح پرائیویٹ اسکولوں کو پوشاک اور سائیکل ملتی ہے ہمیں بھی ملتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسکول کی خدمات کے پیش نظر اسے جلد منظوری دی جائے۔ سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ جن ہندی اسکولوں کی عمارتیں نہیں ہیں، کرایے کے مکان میں قائم ہیں انھیں محکمہ منظوری دے رہا ہے مگر ملت اردو ہائی اسکول کے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے اسے منظوری نہیں مل رہی ہے۔

(انقلاب۔ دہلی)

# نئی کتابیں

**تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے**

نام کتاب : مکاتیب مشاہیر
(مرحوم مشاہیر اردو کے خطوط بنام اثر)
مرتب : پروفیسر محمد علی اثر
ضخامت : 264 صفحات
قیمت : 250 روپے
ملنے کا پتا : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 3108، وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں دہلی-110006
تبصرہ نگار : پروفیسر عقیل ہاشمی (؟)

اردو کی غیر افسانوی نثر میں مکتوب نگاری بھی ایک خاص فن کا درجہ رکھتی ہے۔ عمدہ اور دل چسپ خطوط ادبی فن پاروں کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر ایسے خطوط جو مشاہیر کے زور قلم کا نتیجہ ہوں اور جن میں تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر بالکل غیر رسمی انداز میں گفتگو کی گئی ہو، ان میں مکتوب نگار کی شخصیت کھل کر سامنے آتی ہے۔ ہم مشاہیر سے جس قدر متاثر ہوتے ہیں اسی قدر ان طرح کی شخصیات کی زندگی اور ان کے ذاتی حالات کے بارے میں جاننے کے مشتاق ہوتے ہیں۔ ہمارے اس شوق کی تکمیل کسی نہ کسی حد تک بلکہ بڑی حد تک ان مشاہیر کے خطوط پڑھنے سے ہو جاتی ہے، جہاں وہ کھل کر اپنے اور دوسروں کے احوال بیان کرتے ہیں۔

مشاہیر کے خطوط کئی وجوہ کی بنا پر ہمارے لیے دل چسپی کا باعث ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے تو خود مکتوب نگار کی شخصیت، اس کا مقام و مرتبہ، اس کی شہرت، اس کی زبان اور طرز بیان وغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ ہماری دل چسپی یہ دیکھنے میں بھی ہوتی ہے کہ مکتوب الیہ کون ہے۔ اگر مکتوب الیہ کی شخصیت بھی شہرت کی حامل ہو تو ایسے مکاتیب ہمارے لیے زیادہ پرکشش ہو جاتے ہیں۔ زیر نظر کتاب 'مکاتیب مشاہیر' میں یہ دونوں خوبیاں مجتمع ہو گئی ہیں۔ اس کے مکتوب نگاروں کی فہرست پر نظر ڈالیے تو محسوس ہوگا کہ اس میں اردو دنیا کے کتنے ہی معروف نام جمع ہیں۔ دوسری طرف مکتوب الیہ بھی کوئی اور نہیں بلکہ عہد حاضر کے ممتاز محقق اور ماہر دکنیات پروفیسر محمد علی اثر ہیں، جنھوں نے دکنیات میں اپنے تحقیقی کارناموں کے ذریعے ایک ایسا منفرد اور قابل رشک مقام حاصل کر لیا ہے جس کو مشاہیر بھی تسلیم کرتے ہیں۔ پروفیسر اثر ایک نقاد اور شاعر کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت رکھتے ہیں لیکن خاص طور پر دکنیات کے مطالعے کے سلسلے میں ان کی تحریریں سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ اردو کے قدیم ادبی سرمایے کی تلاش و تدوین کے سلسلے میں ان کا کام نہایت گراں قدر ہے۔ ناسازی صحت کے باوجود پروفیسر اثر کی مسلسل کاوشوں سے دکنی ادب سے متعلق جن حقائق کا انکشاف کیا ہے اور نوادرات تحقیق کا جو گنج گراں مایہ تیار کیا ہے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اہل نظر ہی خوب کر سکتے ہیں۔

'قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری' کے مصداق ڈاکٹر اثر کو ان کے تحقیقی کارناموں پر جگہ جگہ داد ہماری پیش رو نسل کی طرف سے ملی ہے جن میں ہمارے اساتذہ بھی شامل ہیں اور برصغیر کے کئی مشاہیر بھی جن میں سے بیشتر کا تعلق تحقیق و تدریس سے رہا ہے۔ یہ حضرات تحقیق کے سلسلے میں زیادہ سنجیدہ رہے ہیں اور خود ان کے تحقیقی کارنامے بعد کی نسلوں کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وہ اساتذہ ہیں جنھوں نے ہم کو تحقیق کے اصول اور اس کے طریقہ کار کا درس دیا تھا۔ پروفیسر محمد علی کو بھی داد انھی اساتذہ اور ماہرین فن تحقیق کی جانب سے ملی ہے اور اثر کو اس پر بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ ان بزرگوں کے نزدیک بھی اثر کی رائے سند کا درجہ رکھتی ہے۔ 'مکاتیب مشاہیر' کے اس وقیع مجموعے میں اردو دنیا کی یہ معزز اور قابل احترام شخصیتیں اثر کو جس طرح مخاطب کرتی ہیں اور جس انداز اور جس لہجے میں بات کرتی ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے جیسے کوئی اپنے دوست اور برابر والے سے بات کر رہا ہو۔ ان خطوط کے مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ پروفیسر محمد علی اثر کی علمی، ادبی اور خاص طور سے تحقیقی کاوشوں اور ان کے نتائج سے یہ بزرگ کس قدر متاثر تھے۔ جگہ جگہ ان بزرگوں نے دکنیات کے سلسلے میں اثر سے مدد بھی چاہی ہے اور بعض مخصوص موضوعات پر ان سے مضامین لکھنے کی خواہش کی ہے۔ کسی نے ان سے کتابیں بھیجنے کی فرمائش کی ہے تو کسی نے ان کی شاعری کو سراہا ہے۔ مغنی صاحب ان کو ادارۂ ادبیات اردو (حیدرآباد) کے شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کا رکن بنائے جانے کی اطلاع دے رہے ہیں تو کراچی سے پروفیسر حمید الدین شاہد صاحب 'سب رس' (کراچی) کے لیے مضامین بھیجنے کی فرمائش کر رہے ہیں۔ ان میں سے بیشتر حضرات کے خطوط میں ایک بات مشترک یہ ہے کہ انھوں نے اثر کی خرابی صحت پر اپنی تشویش اور تعلق خاطر کا اظہار کیا ہے اور ان کی صحت یابی کے لیے دعائیں کی ہیں۔ غرض ان صاحب نظر حضرات کے خطوط میں اور بھی بہت سی ایسی باتیں اور کئی ایسے اہم نکات ملتے ہیں جن سے ہم مستفید ہو سکتے ہیں۔ ان خطوط کو پڑھتے ہوئے ایک اور خاص بات جو نمایاں ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اردو دنیا کی ان ممتاز شخصیات سے پروفیسر محمد علی اثر کے روابط کتنے قریبی رہے ہیں۔ ہمارے احباب میں اثر کے علاوہ شاید ہی کوئی اور ہوں جن کے ساتھ ایسی منتخب اور بلند پایہ شخصیات نے ایسے قریبی روابط رکھے ہوں اور مراسلت کا یہ سلسلہ بھی قائم رکھا ہو۔ اس سے پروفیسر اثر کے حلقۂ اثر کی وسعت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ 'مکاتیب مشاہیر' کے اس مجموعے میں صرف انھی حضرات کے خطوط شامل ہیں جو اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

پروفیسر محمد علی اثر ہماری مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے چالیس مشاہیر کے ایک سو ستر مکاتیب کی مدد سے ایک ایسی انوکھی محفل آراستہ کی ہے جس میں آسمان ادب کی ایک کہکشاں اتر آئی ہے اور اس میں پروفیسر اثر کی شخصیت مرکزی حیثیت رکھتی ہے اس لیے کہ وہی ان مکاتیب مشاہیر کے مکتوب الیہ ہیں۔ ڈاکٹر اثر کا یہ اقدام لائق تحسین ہے کہ انھوں نے کئی برسوں کے دوران اپنے نام آئے ہوئے ان خطوط کو محفوظ رکھا اور اب نہایت سلیقے کے ساتھ ان کو ترتیب دے کر ایک کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔ پروفیسر اثر نے اس کتاب کا جو مقدمہ تحریر کیا ہے وہ اس قدر جامع ہے کہ اس کے بعد مزید کسی تعارفی تحریر کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ نہ اس کتاب کے مکتوب نگار تعارف کے محتاج ہیں اور نہ ہی مکتوب الیہ کی شخصیت غیر معروف ہے۔ آپ کتاب پڑھیے گا تو اس کی قدر و قیمت کا اندازہ آپ ہوگا۔

●✿●

## بقیہ: مولانا آزاد، سردار پٹیل...

صفحہ ۳ سے آگے

وفد لے کر پاکستان گئے تھے اور اسی کو پیارے ہو گئے تھے۔ خیر گزری کہ سردار نے اپنی زندگی میں اپنے پسندیدہ شاعر جوش کو پاکستان سدھارتے نہیں دیکھا۔

آزادی کے بعد وہ صرف تین برس چار ماہ زندہ رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ گاندھی جی کی ناراضگی جو نفرت میں بدل گئی تھی نہ سہہ پائے تھے اور ان کے قتل کے سانحے کے چند ماہ بعد دل کے مریض بن گئے تھے۔

آزاد ہند کی تاریخ میں سردار کا سب سے بڑا کارنامہ ایک ہی سال میں 562 دیسی ریاستوں (جن میں 366 گجرات میں تھیں) کا ہندستان سے انضمام کرانا تھا، جس کے لیے انھوں نے سام دام ڈنڈ بھید ہر حکمت عملی سے کام لیا تھا۔ اسی دوران انھوں نے کانگریس کی تنظیم کو مضبوط کرنے اور ملک کے حالات کو معمول پر لانے میں بھی کامیابی حاصل کر لی تھی۔ سردار ایک انتہائی فعال اور less tractable لیڈر تھے۔ مولانا آزاد نے ان کی انتظامی صلاحیت اور اپنے مقاصد کے لیے جو عزم دیکھا تھا وہ سردار کے بعد انھوں نے شاید ہی کسی میں پایا ہو۔ ہوا بھی تقسیم کے بعد کی خوں ریزیاں اور فسادات تو وہ سب اس تقسیم کا لازمی نتیجہ تھا جسے مولانا جانتے تھے اور لوگوں کو خبردار کرتے رہے تھے، لیکن سات کروڑ انسانوں کا گلہ ان کی بات ماننا نہیں چاہتا تھا۔ آخر دس برس بعد پٹیل کو اپنا جانشین منتخب نہ کرنے کے اپنے فیصلے پر افسوس کا اظہار کر کے مولانا نے انھیں ان پر لگے الزامات سے بری کر دیا تھا۔

**حواشی:**

۱۔ 100 GLORIOUS YEARS - 1885 - 1985

۲۔ 1997ء میں چھپی انجمن ترقی اردو (ہند) کی یہ کتاب اس عہد مطبوعہ کا بنیادی ماخذ اور دستاویز ہے۔

۳۔ انھیں جو عزت و شوکت اور آسائش ان کے عہدہ و منصب کے لحاظ سے حاصل تھیں، اس پر انھوں نے کہا تھا کہ میرے دہقانی مزاج کو یہ تکلفات راس نہیں آتے۔

۴۔ 'جامع العلوم انسائیکلوپیڈیا - تاریخ' (قومی کونسل، نئی دہلی)، ص 102 (پہلا ایڈیشن)

۵۔ 'ہماری آزادی' میں یہ باتیں بکھری ہوئی ہیں۔

●✿●

## بقیہ: مرزا غالب کا ایک نادر خط

صفحہ ایک سے آگے

اپنی کتاب 'غالب' ہند کے ساتھ شائع کیا تھا۔ حال ہی میں دوسرا خط پرتو روہیلہ نے اپنی نئی کتاب 'غالب کے غیر مدون فارسی مکتوبات' میں شائع کر دیا ہے۔ لیکن پہلا خط ہنوز بحث و مطالعہ کا محتاج ہے۔ ذیل کی سطور میں اس خط کی قرأت اور اس کا ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی اس کا عکس بھی شامل ہے۔ قرأت اور ترجمہ میں حتی الامکان احتیاط برتی گئی ہے تاہم اس میں اصلاح کی گنجائش ہے۔

ارسطو جاہ مولوی رجب علی

یا رب! آگہی دہ کہ یا می سرائی نمود جز بہ آہ و نالہ کار مبادا و لب یا علی سرائی سخن جز بہ صفت آزادگان مجنف قبلہ زمزمہ سنج گفتار مباد، وہ است کہ آزادۂ فرقی نہاد و وارستگی خوی و درویشی ادای و شرفی اندیشہ خواجہ کرم پیشہ بیشتر از انچہ تواں گفت بی شنودہ ام و بملاقات یگانگی ولای مرتضوی کہ پیوند آمیزش معنوی است، پیوستہ در بند ایں سگالش بی بودہ ام کہ چہ می باید کرد تا روشناس توان شدہ باری چون گزارش راست بود کشایش درست آمد۔ دلال جواہر سخن بزبان قلم با من گفت کہ سید بخشی حضور نواب پاگشتہ دل غالب آشفتہ نوا سرای ہمانا میر جیحو نسب والسوی ذات ہیدست و پا نگری ہست۔ بہر ستادن مجموعہ اشعار و دراں انجمن راہ یافتن شور و داد فزوں سری سم بدیں مایہ از رہ امیدواری بشادمانی پیچ و دل بست۔ پس از دو ہفتہ دل سوا زدہ را از فریب بخت ایں اندیشہ نجیب ریختہ کہ رسیدن کتاب را اگر بعہد منظور و مقبول افتد و از افزوں تر از ایں نتواند بود کہ ارمغان را بجواہر سخن نہایند کہ این سفینہ بخشش آشنائی ہست و اں ستودہ خوی از ایں گفتن عین حرف اگر جگر تشنگی التفات سخت است آں خوش تر کہ بدان گوی ایں فرش یعنی خامہ کہ سپہر سخن را سروش است آورده آیہ سجدہ ہائے نیاز کہ در جبہ ناخدا سر نوشت قوام است آں قتل و تحویل بر گوشہ بساط بزم ادم رنگ فرو ریزد:

جوام زندہ و نادیدہ مرا پای تو نگاہم

# غالب کے خط کا عکس



ز سراپائے تو کاں جان من است
شرط اسلام بود ورزش ایمان بالغیب اے کہ اے
تو غائب زنظر مہر تو ایمان من است
چشم داشت آں کہ در پرسش
خاکنشیناں فروگزاشت نرود، پے نگاشتن
پاسخ ایں نامہ کہ گوئے خط بندگی است
آبروئے بندہ در بندگان افزودہ شود تا
چنانکہ بہ رسیدن پیش کش وا رسد بہ پیش
آید اقبال قبول بندگی نیز فرا رسد ور
فرستادن نامہ از رو گرد نہ آمدن نشان
مسکن و منزل دل ناشد و بہ سر آں نہ
پیچید کہ خواہی نہ خواہی بہ نور دنامہ جواہر
سنگھ می باید چپید و جز بدیں بیچ اخباب
عنواں فرستاد ہر چند رو دلی از نام آوراں
نیم اما نہ آنست کہ روشناس نام آوراں نیم
بر عنوان نامہ نام شہر و نام من کہ بعد ازیں
شہرم بس است بدیں قدر نگارش کہ ایں
منشور رافت در دلی بر اسداللہ بر سد شک
نیست کہ نامہ بہ بندہ درگاہ برسد گرامی
آقا عبدالباقی و مشفقی مولوی محمد گل شاہ بر
کہ ازیں دو فرزانہ یگانہ ور آں تو آمیں
انجمن جا داشتہ باشد بہ پذیرفتن سلام از
من برمن از خویشتن سپاس نہد۔
والسلام مع التعظیم والاکرام از اسداللہ
نامہ سیاہ نگاشتہ روز سہ شنبہ ہژدہم مئی
۱۸۴۷ء۔ محمد اسداللہ خاں غالب۔

ترجمہ

اے میرے رب اور قمر آپ ہی
جو یا علی نہ کہے اس کو آنکھ و پلک کے علاوہ
کوئی کام نہ ہو اور میرے یا علی کا نعرہ
لگانے والے ہونٹوں کو تحفے کے محترم
حد آزادؤں (عاشقان اہل بیت) کے
علاوہ کسی کے لیے نغمہ سرا نہ ہے، ایک
عرصے سے خواجہ کرم چند کی شہرت، خوش
خصالی، بصیرت اور فکر عمیق کا شہرہ جتنا
کہ بیان کیا جا سکتا ہے اس سے زیادہ
سنا ہے، اور آپ کے ساتھ ولائی مرتضوی
کے باعث اپنائیت کا جو رشتہ ہے وہ
معنوی طور پر جڑا ہوا ہے۔ میں مستقل
اس فکر میں تھا کہ آپ سے رابطہ کی کیا
صورت ہوسکتی ہے۔ چوں کہ طلب صادق
تھی اس لیے اس کی سبیل بھی نکل آئی۔
لالہ جواہر سنگھ نے بذریعہ خط مجھے یہ مژدہ
سنایا کہ سید جو خود شاعر بھی ہیں اور سخن ور
نواز بھی، کو غالب کی طرف اسی طرح
توجہ ہے جس طرح آفتاب جہانتاب کی
ایک حقیر سے ذرہ کی طرف ہوتی ہے۔
اس لیے ان کی خدمت میں اپنا مجموعۂ
اشعار بھیج کر باریابی کی راہ نکالی ہے۔
اور اس فکر سے بھی زیادہ اس سرمایہ
بے مایہ کے ذریعے دل اس عرض داشت
کے جواب کی شادمانی اور امیدواری میں
لگا ہوا ہے۔ دو ہفتے کے بعد یہ بے چین دل
کو عجیب سے یہ خیال دل میں آیا کہ اگر
کتاب پسند خاطر ہوئی تو اس سے زیادہ
توقع ہوگا کہ اس تحفہ کو جواہر سنگھ دکھا ئیں
گے کہ یہ تمہارے جاننے والے کو مجبور
ہے اور وہ نیک خصال یہ گفتگو مجھ کو لکھ
بھیجیں گے۔ اگرچہ التفات کی تشنگی اس
سے زیادہ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ وہ خاموش
بولنے والے یعنی قلم جو کلام کے آسمان کا
فرشتہ ہے کے دامن میں سجائے تا کہ وہ
تمام سجدہ ہائے نیاز جو پیشانی میں آپ
کے خط کے لیے ہیں اس نقل و تحویل کے
ذریعے اس بزم جو رشک جنت ہے کے
گوشہ بساط پر نثار کر دیں۔

میں تجھ سے زندہ ہوں اور بغیر
دیکھے ہوئے تیرے سراپا کے تصور میں
ہوں۔ چوں کہ تیرا سراپا میری جان
ہے + اسلام کی شرط ایمان بالغیب ہے۔
اے میری نظروں سے غائب تیری محبت
میرا ایمان ہے۔

امید ہے کہ ان خاک نشینوں کی
احوال پرسی میں کوئی کمی نہیں فرمائیں
گے۔ یہ خط جو کہ گویا خط بندگی ہے۔ اس
کے جواب لکھنے سے بندہ کی عزت لوگوں
میں زیادہ ہوگی۔ جہاں تک اس تحفے کی
خبر پہنچے گی تو بندگی کی قبولیت کی خبر بھی
ساتھ ساتھ پہنچے گی۔ خط لکھنے میں یہ
بات مانع نہ ہو کہ مسکن و منزل کا پتا
نہیں۔ اس میں کوئی تردد نہ ہو اور ہر حال
میں یہ نہ سوچیں کہ خواہی نہ خواہی جواہر
سنگھ کے لفافے میں خط بھیجیں اور صرف
اس وجہ سے خط لکھنے میں تردد نہ ہو۔
اگرچہ دلی کے اندر بہت مشہور نہیں ہوں
لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ مشہور لوگوں کا
روشناس نہیں ہوں۔ پتا میں میرا نام اور
میرے شہر کا نام جس میں میں ہوں کافی
ہے۔ صرف اتنا لکھ دینا کہ یہ مہربانی نامہ
دلی میں اسداللہ کو پہنچے۔ اس میں شک
نہیں کہ خط اس بندہ درگاہ کو مل جائے
گا۔ میرے شفیق آقا عبدالباقی اور میرے
مشفق مولوی محمد گل شاہ یہ دونوں یگانہ و
فرزانہ لوگوں میں سے ہیں ان میں سے
جو بھی اس انجمن کو آئیں میں موجود ہوں
میرا اسلام قبول کرکے میرے اوپر احسان
کریں۔ والسلام مع التعظیم والاکرام۔
اسداللہ کی طرف سے مکتوب سہ شنبہ ۱۷؍
مئی ۱۸۴۷ء۔

•◊•

'ڈی فارم'
ہفتہ وار 'ہماری زبان'
نئی دہلی

۱- مقام اشاعت: اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
۲- وقفۂ اشاعت: ہفت روزہ
۳- پرنٹر کا نام: شاہد خاں
شہریت: ہندوستانی
پتا: اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
۴- پبلشر کا نام: شاہد خاں
شہریت: ہندوستانی
پتا: اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
۵- ایڈیٹر کا نام: اطہر فاروقی
شہریت: ہندوستانی
پتا: اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
۶- ان لوگوں کے نام جو اخبار کے مالک یا حصے دار ہیں یا ایک فیصد حصص کے مالک ہیں:
انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

"میں شاہد خاں تصدیق کرتا ہوں کہ اوپر دی گئی معلومات میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں۔"

**شاہد خاں**
(فروری ۲۰۱۳ء)
انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

پہلی قسط

# اچھی نثر کی خصوصیات

رؤف خیر (موتی محل، قلعہ گولکنڈہ، حیدرآباد 500008، آندھراپردیش)
E-mail: raoofkhair@yahoo.co.in

میرے خیال میں نثر لکھنا غزل کہنے سے زیادہ مشکل ہے۔ کیوں کہ غزل میں قافیہ و ردیف کے سہارے خوش آہنگی پیدا ہو ہی جاتی ہے اور ہر شعر کا کچھ نہ کچھ مطلب نکالا ہی جا سکتا ہے جب کہ نثر وضاحت اور منطقی جواز سے عبارت ہوتی ہے۔ ایک شعر کے کئی معنی نکالے جا سکتے ہیں یہی سبب ہے کہ غالب کے کلام کی شرحیں آج تک لکھی جاری ہیں مگر نثر کے پڑھنے کا عموماً ایک ہی متعین مطلب ہوتا ہے۔ جو معنویت دراصل زبان کا حسن ہے یہ کہنے اور سننے یا لکھنے اور پڑھنے والے کی خوش ذوقی کا غماز ہوتا ہے۔ فقرہ بازی کا یہی تو مزہ ہے کہ بات دل پر اثر ضرور کرے مگر دل نہ توڑے۔ یہ ہنر زبان و بیان پر دسترس سے آتا ہے۔ مثلاً غالب کے لطیفے، جیسے آم بیزار شخص جب غالب سے کہتا ہے کہ آم تو ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔ جواباً غالب کہتے ہیں "ہاں گدھے آم نہیں کھاتے"۔ اس فقرے میں بلاغت کی ایک دنیا آباد ہے۔ اس میں شک نہیں بعض شعر بھی فصاحت و بلاغت کے شاہکار ہوتے ہیں، جیسے:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یا پھر:

ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے
کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے

سہل ممتنع کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ ایسا شعر جو نثر سے اتنا قریب ہو کہ اس کی مزید نثر نہ کی جا سکتی ہو۔ یہی اس کا حسن ہے۔ گویا نثر کا حسن شعر پر غالب ہے۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ شعر تو ہر وہ شاعر جو قافیہ و ردیف سے آگہی رکھتا ہو، کہہ لیتا ہے مگر مصرع کہنا بہت مشکل ہے، مصرع کہنا اک ہنر ہے۔ میرا مطلع ہے:

شعر کہنا اگر آ جائے تو مصرع کہنا
آتے آتے ہمیں آ جائے گا مطلع کہنا

اسی طرح اچھی نثر لکھنا بھی ایک ہی کمال ہے۔ ہر لکھنے والے کو لکھنا نہیں آتا:

ہر ایک شخص کو لکھنا کہاں یہ آتا ہے
ہماری طرح لکھا کر کرے ہے کچھ لکھنا

شاعر کو خود یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اگلا شعر وہ کیا کہنے والا ہے۔ جب شعر اس سے ہو جاتا ہے تب خود اسے پتہ چلتا ہے کہ یہ بات اس کے شعر سے برآمد ہوئی ہے جب کہ نثر لکھنے والا جو سوچتا ہے اسی کو الفاظ کے حوالے کرتا ہے یعنی اس کی فکر طے شدہ ہوتی ہے "جو قافیے پہ بیت گئی وہ تو سنا دی" والا معاملہ نہیں ہوتا۔ گویا نثر کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ موضوع و منشا طے شدہ ہوتا ہے۔ یہ کوئی مصرع طرح پر کہی جانے والی غزل نہیں ہوتی۔

نثر کی دوسری بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ تکلف و تصنع سے عاری ہوتی ہے۔ دو ٹوک انداز میں جو بات دل سے نکلتی ہے وہ ظاہر ہے دل پر اثر بھی کرتی ہے۔ پیچ دار، پر تکلف گفتگو کرنے والے کو سننے والے طرح دے جاتے ہیں دل میں جگہ نہیں دیتے جیسے لیڈروں کی تقریریں۔ فٹ پاتھی دوا فروشوں اور مداریوں کی باتیں دل چسپی سے سنی تو جا سکتی ہیں مگر ان پر یقین کرنے والا دھوکا کھا جاتا ہے۔ گویا نثر کی خوبی یہ ہے کہ یہ کسی خالی پر ایمان نہیں لاتی بلکہ یکسی تحریر کا تقاضا کرتی ہے۔ اسی لیے ایک عام محاورہ ہے سوچے ایک لکھے۔ بات جب تحریر میں آ جاتی ہے تو پھر مصدقہ ہو جاتی ہے اور تحریر کھٹک اور مبہم نہ ہو۔ ابہام بھلے ہی شعر کے لیے حسن کا درجہ رکھتا ہو، نثر کے لیے عیب ہے۔ نثر تحقیق سے عبارت ہے اور تحقیق کبھی مبہم نہیں ہوا کرتی۔

شعر میں تعقید شاعرانہ مجبوری کا نام ہے کہ بحر کے تقاضے پورے کرنے کے لیے شاعر الفاظ کو آگے پیچھے کرنے پر مجبور ہوتا ہے مگر نثر میں تعقید بہت بڑا عیب ہے۔ بغیر کسی کاوش کے جو مثال ہاتھ لگی ہے وہ پیش کرتا ہوں:

مرزا فرحت اللہ بیگ "ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" میں فرماتے ہیں: "محاوروں کے استعمال کا شوق مولوی صاحب کو حد سے زیادہ تھا"۔ میرے خیال میں یہ جملہ یوں ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا: "مولوی صاحب کو محاوروں کے استعمال کا حد سے زیادہ شوق تھا"۔ معاف کرنا میں ذرا جسارت بے جا سے کام لے رہا ہوں کہ اہل زبان کی زبان پر گرفت کرنے لگا ہوں۔ ڈھونڈنے والوں کو خود اس مضمون میں کئی خامیاں مل جائیں گی۔ آدمی لکھتے وقت ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر دھیان دینے لگے تو اصل موضوع رہ جائے، لیکن نثر کی خوبی و خرابی کی نشان دہی بھی تو ضروری ہے۔

میرے خیال میں اچھی نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ جملے چھوٹے چھوٹے ہوں اور اپنی جگہ مکمل ہوں۔ مرکب جملے Complex Sentence نثر کے حسن کو متاثر کرتے ہیں۔ مولانا علی میاں ابوالحسن علی ندوی کی تحریروں میں مرکب جملے بہت کھلتے ہیں شاید یہ عربی اثر ہے۔ آپ اگر حقیقت کو اک ذرا پرے رکھ کر ان کی کتابوں کا مطالعہ کریں تو کئی مثالیں مل جائیں گی۔ Randomly میں نے سہ ماہی "آمد" کا صفحہ ۱۰۵ کھولا تو وحید عرفان کے مضمون کا پہلا ہی جملہ کچھ یوں دکھائی دیا:

"بیسویں صدی کے نصف اول میں ہی جب کہ مختصر افسانے کے تیس و نقش ابھر رہے تھے اور مختصر افسانہ رومانی حکایات اور خواب آگیں فضا کے سائے میں اپنی مستقل پہچان قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ترقی پسند تحریک نے اسے حقیقت پسندی اور سماجی صداقت نگاری کے اثر انگیز لطف سے آشنا کرایا"۔

یہ دراصل تین جملے ہیں جو خواہ مخواہ (جب کہ)، (اور) اور (کہ) کے ذریعے جوڑ دیے گئے ہیں۔ یہ تین الفاظ نکال دیں تو تحریر رواں ہو جائے۔ تیس میں کہ ہندی لفظ کے ساتھ واو عطف استعمال نہیں کیا جاتا (تیس و نقش) کہنا نامناسب ہے۔

گویا اچھی نثر چھوٹے چھوٹے جملوں میں ہی مزہ دیتی ہے۔ ہر جملہ اپنی جگہ مکمل بھی ہوتا ہے اور اپنے اگلے جملے سے مربوط بھی ہوتا ہے۔

نثر حسیت سے بھرپور ہوتی ہے اور جہاں حسیت ختم ہوتی ہے وہاں سے غنائیت سے بھرپور شعریت شروع ہوتی ہے جس میں نئے نئے معانی و مفاہیم فرض کر لیے جا سکتے ہیں۔ نثر میں ہر بات کی دلیل دینی پڑتی ہے ورنہ بات ناقابل اعتنا ٹھہرتی ہے۔ ویسے دعویٰ اور دلیل کی ہم آہنگی ہی سے اچھا شعر بھی وجود میں آتا ہے۔

نثر زیادہ تر پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے اس لیے پڑھنے والا زبان و بیان اور موضوع سب پر نظر رکھتا ہے جب کہ شاعری عموماً سننے میں زیادہ مزہ دیتی ہے کہ اس میں جو غنائی پہلو ہے وہ پہلے سامعت کو متاثر کرتا ہے تب کہیں دل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ کلام شاعر بہ زبان شاعر بھی سنیں تو قاری خود بہ آواز بلند اسے پڑھتے ہوئے اس کی خوش آہنگی سے لطف اندوز ہوتا جاتا ہے۔ نثر میں غنائی عنصر نہیں ہوتا بلکہ منطقی جواز ہوتا ہے جو قلم کار و قاری دونوں سے فکر و تدبر کا تقاضا کرتا ہے اور وہی تحریر معتبر ٹھہرتی ہے جو یہ تقاضے پورے کرتی ہے۔

ردیف کی مجبوری کی وجہ سے بعض وقت شاعر ایسے الفاظ استعمال کر جاتا ہے جو حشو و زوائد شمار ہوتے ہیں، جیسے جہان میں ہے، مکان میں ہے، خاندان میں ہے وغیرہ وغیرہ کے ساتھ "درمیان میں ہے" کہہ دیتا ہے جب کہ "درمیان" کے ساتھ (میں) کی ضرورت نہیں۔ نثر لکھتے ہوئے (میں) حذف کرنا پڑے گا جیسے "دونوں کے درمیان معاہدہ طے پایا"۔ نثر میں حشو و زوائد سے آسانی سے بچا جا سکتا ہے کہ کوئی شعری مجبوری نہیں ہوتی۔

ابن صفی کے تمام ناولوں میں لفظ (دوران) کے ساتھ بھی (میں) استعمال ہوا ہے جب کہ یہاں بھی لفظ (میں) غیر ضروری ہے۔ "اس دوران پولیس آ گئی" لکھنا کافی ہے۔ "اس دوران میں پولیس آ گئی" نامناسب ہے مگر ابن صفی نے ہمیشہ دوران کے ساتھ (میں) کا استعمال کیا ہے۔ ابن صفی بہت اچھی زبان لکھتے تھے مگر ایسے جملے بھی لکھ جاتے تھے۔

(باقی آئندہ)

*****

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: شمرہ آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲ - راؤز ایونیو، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ) دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک آٹھ امریکی ڈالر)
Phones, 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org